Discourse of Social Inequality and Race in Urdu Novel

Muhammad Naeem

▶ **To cite this version:**

Muhammad Naeem. Discourse of Social Inequality and Race in Urdu Novel. Tahqeeq Nama, 2024, 34 (34), pp.5-19. hal-04637805

HAL Id: hal-04637805
https://hal.science/hal-04637805

Submitted on 7 Jul 2024

HAL is a multi-disciplinary open access archive for the deposit and dissemination of scientific research documents, whether they are published or not. The documents may come from teaching and research institutions in France or abroad, or from public or private research centers.

L'archive ouverte pluridisciplinaire **HAL**, est destinée au dépôt et à la diffusion de documents scientifiques de niveau recherche, publiés ou non, émanant des établissements d'enseignement et de recherche français ou étrangers, des laboratoires publics ou privés.

Distributed under a Creative Commons Attribution - NonCommercial 4.0 International License

اردو ناول میں سماجی عدم مساوات اور نسل کا کلامیہ

Discourse of Social Inequality and Race in Urdu Novel

محمد نعیم

Abstract:

Inequality has many social forms. Economic, religious, ethnic and gender are the general differential phenomena on the basis of which the difference between the benefited and the deprived is found in the society. This difference becomes social when it is aimed at a group of people rather than the individual. Discrimination on the basis of race becomes a social reality when it begins to shape the minds of individuals through discourse. The overview of the capitalist economy of the eighteenth and nineteenth centuries India, in this article, is intended to illustrate that discourse formation was influenced by discursive forces. The dominant part in this system was the colonial government which controlled the major part of business and capital. Second, most of the labor market in this system consisted of men. which helps in understanding the forces behind the formation of discourse. With this background, it becomes easy to understand who is getting what position in the discourse of Urdu novel and how this position is directly and indirectly related to the socio-economic structure. The novel had group differences based on the distribution of wealth and access to financial resources, but in the Urdu novelistic discourse, ethnic consciousness is found more than class consciousness. Often writers discriminate between individuals on the basis of ethnicity rather than wealth or poverty. This article using the methods of discourse analysis, traces the order of the

discourse and production of discourse through the lens of Urdu novel.

طبقاتی سماج میں تعلیمی نظام اور تعلیمی کلامیہ دونوں طبقاتی ایجنڈے کو تسلسل فراہم کرتے ہیں۔ تعلیمی کلامیہ سماجی کنٹرول کے حامل طبقات کے مفادات کو دوام بخشنے والی آئیڈیالوجی اور اقدار کو اکثر غیر محسوس انداز میں فروغ دیتا ہے۔۱؎ کلامیے پہ کنٹرول اپنے گروہی مفادات کو تسلسل دینے کا بنیادی ذریعہ ہے۔ کلامیے کی مدد سے غالب گروہ (Dominant group) ذہن سازی کرتا ہے۔ وہ اپنی مراعات یافتہ پوزیشن کی وجہ سے تعلیم، علم، سماجی اور سیاسی مادی و غیر مادی ذرائع پہ کنٹرول رکھتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ محکوم گروہ ان ذرائع تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ اس طرح موجود عدم مساوات کو دوام بخشا جا سکتا ہے۔۲؎

سماجی عدم مساوات کو قائم کرنے اور رکھنے میں سب سے زیادہ دلچسپی اور مفاد حاوی اشرافیہ (Dominant Elites) کا ہوتا ہے۔ ڈائیک کے ہاں تجزیے کے دوران میں خود شناسی (Reflexivity) کا پہلو ملتا ہے۔ وہ اس بات سے آگاہ ہے کہ لکھنے والے (تخلیق کار ہوں یا نقاد) وہ بھی عموماً مراعات یافتہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تنقید لکھتے ہوئے اس پہلو کو عموماً فراموش کیا جاتا ہے کہ لکھنے والا خود کم از کم محروم یا مراعات یافتہ طبقے میں سے کس کے سے وابستہ ہے اور اس کی وابستگی غیر شعوری طور پہ بعض اوقات تجزیے میں "ترحم" کی صورت در آتی ہے، جس میں کبھی کبھی تحقیر کا پہلو بھی موجود ہوتا ہے۔ ڈائیک مصنفین کے لیے درسی یا علامتی اشرافیہ (academic or symbolic elite) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔۳؎ وہ دکھاتا ہے کہ حاوی اشرافیہ پہ تنقیدی پوزیشن لینے کے دوران میں خود تنقیدی رویہ اپنانا ضروری ہے۔

عدم مساوات کی کئی سماجی صورتیں ہیں۔ معاشی، مذہبی، نسلی اور صنفی وہ عمومی افتراقی مظاہر ہیں جن کی بنیاد پہ سماج میں مستفید اور محروم کا فرق پایا جاتا ہے۔ یہ فرق تب سماجی بنتا ہے جب اس کا نشانہ فرد کی بجائے افراد کا کوئی گروہ ہو۔ نسلی بنیاد پہ امتیاز قائم کرنا تب ایک سماجی حقیقت بن جاتا ہے جب یہ کلامیے کے ذریعے افراد کی ذہن سازی کرنے لگے۔

سرمایہ دارانہ سماج طبقاتی ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ برعظیم کا سماج کس نوع کا طبقاتی نظام رکھتا تھا؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے برعظیم کی سماجی و معاشی تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔ سماجی درجہ بندی کی تفہیم کے لیے ہمارے موضوع کی مناسبت سے اٹھارویں اور انیسویں صدی کی صورتِ حال کا مختصر تعارف کفایت کرے گا۔ زیادہ تفصیل میں جائے بغیر ہم ان دو صدیوں میں سماج و معیشت کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔ اٹھارویں

صدی کے ہندوستان میں پیداوار اور اس کی تقسیم کا نظام وراثتی پیشہ ور ذاتوں کے ادارے پہ بنیاد رکھتا تھا۔ ان کے علاوہ غیر زرعی ذاتیں بھی تھیں جن کا روایتی طور پہ پیداوار میں مخصوص حصہ ہوتا تھا۔ اور بقول تپن رائے چودھری بعض صورتوں میں زمین میں بھی ان کا حصہ ہوتا تھا۔ ایسی ذاتوں کے پاس اپنی اشیا اور خدمات بیچنے کی آزادی ہوتی تھی۔ معاشی تنظیم کی متعینہ کار کی حیثیت سے ذات دو باہم متضاد طرزیں رکھتی ہے۔ اول یہ کہ کسی پیشے میں ایسی کامل مہارت حاصل کر لی جاتی تھی، جس کے نتیجے میں اس مہارت کے حامل گروہ کی ایک مخصوص حیثیت قائم ہو جاتی تھی۔ جیسے دگبار گھی اور گنا رکھنے والے چمڑے کے تھیلے بناتا تھا، وہ چمڑے کے رسے اور جوتے بنانے والے چمار سے پیشہ وارانہ سطح پہ یکسر مختلف ہوتا تھا۔[۲۴] بہار کے دہی بنانے والے دو باہمی مختلف ذیلی ذاتوں میں ممیز تھے: گوریا جو پہلے مکھن نکالتے اور مجروتی جو پہلے دودھ جماتے تھے۔ بہار میں مسلم اور ہندو اشراف کی ایک بڑی تعداد خود کھیتی باڑی کرتے تھے۔

دیہات کی دو قسمیں مغل دور میں عام تھیں: رعیتی اور تعلق داری۔ تعلقداری دیہات عموماً کسی زمیندار کے قبضے میں ہوتے تھے جو 'پیش کش' ادا کرتا تھا یا عام محصول ادا کرنے کی بجائے عسکری خدمات سرانجام دیتا تھا۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی تھا کہ کئی دیہات متعدد زمینداروں کی ملکیت ہوتے تھے، جن میں کا ایک باقی کی نمائندگی کرتے ہوئے محصول ادا کرتا تھا، یا خرید کر کسی نئی زمینداری کا حصہ بن سکتا تھا۔ رعیتی دیہات محصول ادا کرنے والے زمینداروں کے دائرہ کار سے باہر ہوتے تھے اور محصول کے عام معیاری نظام کے پابند ہوتے تھے۔

کاشتکاری سے وابستہ لوگوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: زمینداری رعیت، جو ایک اقلیت پہ مشتمل تھی، جو زمین کے مالک ہوتے تھے اور ان کے پاس وراثت کے قابلِ انتقال حقوق ہوتے تھے، ان میں مقدم یا ملک شامل ہوتے تھے، دوسرا گروہ ان افراد پہ مشتمل ہے جنھیں یہ حقوق حاصل نہ تھے۔ بعد الذکر کو فارسی مآخذ میں اکثر رعایا، مزارع یا آسامی کہا گیا ہے۔ مالکان ایک خاص متعین حد (مخصوص تخمینے) سے زیادہ محصول اکٹھا نہیں کر سکتے تھے اور اس نظام کے ذریعے رعایا کے حقوق کا تحفظ کیا گیا تھا۔

رعیتی علاقوں میں عملدار کی ذمہ داری تھی کہ وہ ذرائع نہ رکھنے والے کسانوں کو مختصر مدت کے لیے تکوی قرضے (takkavi loans) فراہم کرے تا کہ وہ بیج اور کھاد وغیرہ خرید سکیں۔ اس قرضے کو فصل کٹنے

کے فوراً بعد ادا کرنا ہوتا، جس سے کسان دباؤ میں رہتے کہ وہ اپنی فصل کٹائی کے فوراً بعد بیچیں اور انھیں کم ہی فائدہ ہوتا، بلکہ اکثر وہ قرض کے ایک نا مختتم چکر میں پھنس جاتے۔

اٹھارویں صدی کے وسط تک زرعی میدان میں بھی منڈی کی مختلف قوتیں شامل ہو رہی تھیں۔ غریب کسان کو پیداوار ممکن بنانے کے لیے مختلف مدوں میں قرض لینا پڑتا جس کے لیے وہ تاجروں / ساہوکاروں کے محتاج ہو رہے تھے۔ اس قرض کو ادا کرنے کے لیے فصل کو کٹائی کے فوراً بعد بیچنا ضروری ہو جاتا۔ دیہات اور قصبوں کی سطح کی منڈیاں وجود میں آ رہی تھیں، پیداوار اور فصلیں منڈی مرکز ہو رہی تھیں، اسی طرح زری فصلیں (cash crops) جیسے نیل، گنا، شہتوت اور پوست کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا تھا، جبکہ اس سے قبل زیادہ تر کسان کھانے والی فصلیں (گندم، چاول وغیرہ) ہی اگاتے تھے، ان کے ساتھ ساتھ تمباکو اور مکئی کے علاوہ پھلوں کی کاشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ سرگرمیاں زراعت میں تجارت کاری (commercialization) کی طرف سفر کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

کسان کاشت کاری کے علاوہ اور کئی طرح کی پیداوار میں مصروف تھا۔ اپنے استعمال کے لیے کپڑا تیار کرنا، میسور، مہاراشٹرا، پنجاب اور بنگال تک میں کسانوں کے ہاں عام تھا۔ زراعت سے قریبی تعلق رکھنے والی اشیا کی پیداوار جیسے نیل، ریشم، چینی اور تیل / گھی کی تیاری میں پیداکاروں کے علاوہ کسانوں کا حصہ عام مل جاتا ہے۔ نمک، شورہ اور لوہے جیسی کان کنی پیداواروں میں بھی جز وقتی کسانوں یا کاشتکار ذاتوں کا خاطر خواہ حصہ تھا۔

انیسویں صدی میں برِ صغیر کے شہروں میں کئی ایسے پیشے رفتہ رفتہ سامنے آ رہے تھے، جو اس سے پہلے یہاں عام نہ تھے۔ کمپنی اور بعد ازاں برطانوی حکومت کے دور میں برِ صغیر کا سرمایہ دارانہ معیشت کی طرف سفر تیز ہو گیا۔ مثلاً سرکاری سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور دیگر ملازمتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ان کے علاوہ طباعت اور اشاعت جیسے کاروبار نے کئی نوع کی ملازمتیں پیدا کی تھیں۔ شہروں میں ایسی ملازمتوں کی تخلیق سے معاشی نظام میں سرمائے کی آمدورفت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی طرح سرکاری (سول، فوجی، عدالتی) مشینری میں نچلے اور درمیانے درجے کی ملازمتوں نے ہندوستانیوں کی ایک معقول تعداد کو سرمائے کی معیشت سے منسلک کر دیا تھا۔ اس پہ مستزاد کان کنی، تجارت اور زری اجناس سے وابستہ مزدوروں کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا تھا، جس کا اثر لا محالہ سماجی پردے (social fabric) پہ پڑ رہا تھا۔ سماج میں آجر اور اجیر کے نئے رشتے وجود میں آ رہے تھے، جو دربار اور ریاستی تعلقات سے مختلف تھے۔ معاشی تبدیلی کے نتیجے میں

تعلقات کا سفر درباری سے بازاری کی طرف تھا۔ یاد رہے کہ سرمایہ داری کا یہ سفر کسی آزاد منڈی میں وقوع پذیر نہیں ہو رہا تھا، بلکہ اسے ایشیائی پیداواری طرز اور استعماری اجارہ داری کی حدود کا سامنا تھا۔ اس لیے یہاں ایک اسیر مزدور منڈی (captive labor market) کی تشکیل ہوئی تھی، جس میں استعماری دور کے اختتام تک ہی مزدور اپنے لیے کچھ حقوق حاصل کر سکے تھے۔ اس اسیر مزدوری کے سرچشموں میں قبل استعماری دور کا ججمانی نظام بھی شامل ہے۔ یوں دیکھیں تو سرمائے کی آمد کے ساتھ آزاد منڈی وجود میں نہیں آئی تھی، جس نے سماجی سطح پہ درجہ بند نظام کو کوئی خاطر خواہ نقصان نہیں پہنچایا۔۵؎

اٹھارویں اور انیسویں صدی کی سرمایہ دارانہ معیشت کا یہ اجمالی جائزہ اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے تھا کہ کلامیے کی تشکیل میں نظامِ کلامیہ کن قوتوں کے زیرِ اثر تھا۔ اس نظام میں غالب حصہ استعماری حکومت کا تھا جو کاروبار اور سرمائے کے بڑے حصے پہ قابض تھی۔ دوسرے اس نظام میں موجود مزدور منڈی کا بیشتر حصہ مردوں پہ مشتمل تھا۔ جو کلامیے کی تشکیل کے پیچھے کام کرنے والی قوتوں کی تفہیم میں مدد دیتا ہے۔ اس پس منظر سے سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ کلامیے میں کس کو کیا مقام مل رہا ہے اور اس مقام کا سماجی و معاشی ڈھانچے سے بلا واسطہ اور بالواسطہ کیسا تعلق ہے۔

کلامیہ سماجی ساختوں سے متشکل ہوتا ہے اور سماجی تعلقات کو صورت بھی عطا کرتا ہے۔ یوں کلامیہ سماجی تشکیل بھی ہے اور سماجی تعلقات کا تشکیل کار بھی۔ اسی لیے کلامیہ سماجی استقلال اور تبدیلی ہر دو کی تعمیر میں حصہ لیتا ہے۔ یہیں سے ناول میں موجود ثنوی فکر کے کلامیاتی تجزیے کا جواز ملتا ہے۔ کسی کلامیے کی خصوصیات متعین کرنے میں سماجی حالات کا کردار ہوتا ہے۔ یعنی سماجی حالات کی تبدیلی، کلامیے کے خصائص کو بدل دیتی ہے۔

ہمارا سروکار ناول سے ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ کیا انیسویں صدی کے شمالی ہندوستانی سماج طبقاتی تھا؟ اگر ناولانہ کلامیے کو دیکھا جائے تو ناول دولت کی تقسیم اور مالی وسائل پہ دسترس کی بنیاد پہ گروہی افتراق تو رکھتا تھا، تاہم تحریری کلامیے میں طبقاتی شعور سے زیادہ نسلی شعور کا پتہ ملتا ہے۔ اکثر لکھنے والے امارت یا غربت کی بجائے نسلی بنیادوں پر افراد کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ دوسری بات انیسویں صدی کے برصغیر میں حاوی پیداواری نظام بہر کیف سرمایہ دارانہ نہیں تھا۔ سرمایہ داری کی ابتدائی صورتیں اور سماج میں سرمائے کی بنیاد پہ نئے طبقوں کا ظہور انیسویں صدی میں شروع ہو گیا تھا۔ اس دور میں ابھرنے والا سب سے اہم طبقہ تنخواہ داروں کا تھا۔

استعماری نظام کے سبب سرکاری ملازمین کی حیثیت محض ملازمین کی نہ تھی۔ انھیں عمومی سرمایہ دارانہ نظام کے ملازمت پیشہ افراد کی نسبت کچھ ایسے اختیارات بھی حاصل تھے، جن سے ان کا مقام منفرد حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ عمومی سرمایہ دارانہ نظام کے ملازمت پیشہ افراد کی طرح محض مالی لحاظ سے اپنے متعلقہ طبقے کا حصہ نہ تھے۔ ایک جابرانہ نظام کا حصہ ہونے کے سبب وہ عوامی طبقات سے ممیز تھے، لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ وہ استعماری انتظامیہ کے یورپی افسر طبقے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ان کی سماجی حیثیت یورپی اور عوامی طبقات سے الگ تھی۔ مسلم ملازمت پیشہ افراد کی حد تک امتیاز کا ایک سبب اور بھی تھا: غیر ہندوستانی نسب۔ مسلم ملازمت پیشہ مغل دور میں مصاحبین اور امرا کی صف میں شامل تھی جو خود کو ہندوستانیوں (مسلم اور غیر مسلم ہر دوسے) سے ممیز قرار دیتی تھی۔ اسی گروہ کو استعماری نظام میں سرکاری ملازمت نے امتیاز کی ایک اور بنیاد فراہم کر دی۔ نظام کا حصہ ہونے کے باعث انھیں کلامیے کی پیداوار (production of discourse) اور نظامِ کلامیہ (order of discourse) دونوں پہ عوامی طبقات کی نسبت اجارہ داری حاصل ہو گئی تھی۔ اس پہلو سے دیکھیں تو سرسید کے ایسے بیانات پہ قطعاً حیرت نہیں ہوتی جس میں وہ جنگِ آزادی کی تہمت محنت کش مسلم طبقات پہ دھرتے ہیں۔٦ ان کے ایسے بیانات ملازمت پیشہ مسلم گروہ کے مفادات کو آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ تھے۔ یوں اپنے تعلیمی اداروں میں داخلے کو اسی گروہ کے نوجوانوں تک محدود رکھنے کی سمجھ بھی آ جاتی ہے۔ اردو میں ناول لکھنے والے بیشتر افراد کا تعلق ملازمت پیشہ مسلم گروہ سے ہے، جو خود کو نسلی اعتبار سے ہندوستانیوں سے عموماً اور مقامی مسلمانوں سے خصوصاً ممتاز قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جب ناول لکھتے ہیں تو اپنی تحریروں سے سماجی درجہ بندی کے کلامیے کو مزید تقویت اور دوام بخشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابتدائی اردو ناول نگاروں کے ہاں یہ کاوشیں زیادہ شدت اور کثرت سے دکھائی دیتی ہیں۔ یہیں نسلی ثنویت کا کلامیہ پروان چڑھتا ہے۔ جس کے مطابق اعلیٰ انسانی اور اخلاقی قدروں کا اجتماع اعلیٰ نسل کے لوگوں میں ملتا ہے اور کمتر نسل کے افراد اقدار سے محروم ہوتے ہیں۔ ناول میں کرداروں کی صفات کا تعین بھی ان کی نسل کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔ یا کرداروں کی اعلیٰ اقدار کی بنیاد ان کی نسلی برتری کو بنایا جاتا ہے۔ نسلی ماڈل ویسے تو ایک حد تک انیسویں صدی کے تقریباً ہر ناول میں مل جاتا ہے اور ثنوی اعتبار سے تقابلی فضا بھی عمومی طور پہ ناول کے کلامیے پہ چھائی ہوئی ہے۔ اردو ناول کے ابتدائی پچاس برسوں میں لکھے گئے ناولوں میں کرداروں کے خصائل کی بنیاد عام طور پہ ان کی نسلی وابستگی فراہم کرتی ہے۔ کرداروں کی اعلیٰ اخلاقی صفات بڑی حد تک ان کے خاندانی پس منظر سے

ابھرتی ہیں جبکہ عمومی اخلاقی برائیاں بھی کم تر نسلی گروہ سے تعلق کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ یہ ناول میں نسلی آئیڈیالوجی(ideology of race) کا اظہار ہے، جو اپنے مقاصد میں واضح، دوٹوک اور افتراقی ہوتی ہے۔ اس آئیڈیالوجی کے تحت اپنے اور غیر کی ایک تقسیم وضع کی جاتی ہے اور 'اپنے' کی حفاظت کے لیے غیر کو مخصوص دائرے سے باہر رکھا جاتا ہے۔ ایسی آئیڈیالوجی بہترین صفات اپنوں میں اور بدترین دوسروں میں دیکھتی اور دکھاتی ہے۔ے اس پہلو کے لیے آرسی مصحف(1888)، ہیرے کی کنی(1899) اور آغا صادق کی شادی(1902) جیسے ناولوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

نسلی آئیڈیالوجی کی بنیاد جوہریت پسندی کا مفروضہ ہے۔ ہر مخلوق اور خصوصاً انسان کے بارے رنگ، قد، آنکھیں، اور صنف جیسے طبعی خواص کی بنیاد پر مختلف مفروضے تشکیل دیے جاتے ہیں، جنھیں تحریر و تقریر کے ذریعے کلامیاتی وضع میں ڈھالا جاتا ہے۔ لسانی وسائل اور ذرائع پر کنٹرول کی مدد سے اس کلامیے کی مسلسل تشہیر کی جاتی ہے۔ یوں نسلی آئیڈیالوجی ایک نظریے کی صورت میں وضع کی گئی سچائیوں کو راسخ کرتی ہے۔ سوزین جلمین نے جوہریت پسندی کے حوالے سے وضاحت کی ہے:

> Essentialism is the view that certain categories (e.g., women, racial groups, dinosaurs, original Picasso artwork) have an underlying reality or true nature that one cannot observe directly. Furthermore, this underlying reality (or "essence") is thought to give objects their identity, and to be responsible for similarities that category members share.[8]

نسل کا حیاتیاتی (Biological) تصور فطرت پسندوں (Naturalists) کے ہاں جوہریت(essentialism) کو بنیاد بناتا تھا اور انسانوں کو مختلف نسلی گروہوں میں تقسیم کرتا تھا جس کی بنیاد خون، رنگ یا کھوپڑی کی شکل یا حجم ہوتے تھے۔ جوہریت پسند آنکھوں کی شکل، جلد کی رنگت یا بالوں کی اقسام جیسی خارجی طبعی صفات کے علاوہ نفسیاتی اور مزاجی رویوں کے لحاظ سے بھی کسی نسلی قوم کے افراد میں مماثلت فرض کرتے ہیں۔ نسل کے حیاتیاتی تصور کے حوالے سے عموماً دو نقطہ نظر (approaches) رائج رہے ہیں: نوعی(typological) اور جغرافیائی۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف سے اب تک ان دونوں کو مختلف دلائل اور شواہد کے ذریعے بڑی حد رد کیا جاچکا ہے، کیوں کہ ڈارون اور بعد کی تحقیقات دکھاچکی ہیں کہ کسی نوع

کو یگانہ اور زمان و مکان کے اندر کسی بھی تغیر سے عاری اور دیگر انواع سے یکسر ممیز ثابت کرنا ممکن نہیں، اسی طرح ایک جغرافیے کے اندر بھی طبعی خواص اور جنیاتی خصوصیات کے لحاظ سے منفرد اور یگانہ نسل کا سراغ نہیں ملتا، بلکہ بعض اوقات مذہبی، سماجی اور طبعی حالات کے سبب ایک ہی جغرافیے میں کئی نسلیں موجود ہوتی ہیں۔9

اردو ناول کا عمومی بیانیہ جس کلامیے پہ بنا رکھتا ہے، وہ اپنی نہاد میں ٹھوس اور قطعیت کا حامل ہے۔ ناول میں کرداروں سے عام اور کسی حد تک لچکدار خصوصیات کی توقع تو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں جا کر کہیں ہوتی ہے۔ ابتدائی پچاس برس کے ناول میں کرداروں کی صورت اور سیرت انتہائی نوعیت رکھتی ہے۔ کوئی خوبصورت ہے تو انتہا کا، اور بدصورت ہے تو اسی میں یکتا۔ اس بیانیے کو ایک ہی کردار میں متعدد صفات کے اجتماع سے قائم کیا جاتا ہے۔ ان صفات کا انتخاب ثقافتی معیاراتِ جمال و اخلاق سے بامعنی ہوتا ہے اور صفات عموماً رسومیاتی (conventional) ہوتی ہیں۔ ان میں انفرادی اپج یا کردار کی مناسبت سے اختراع کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار اور قارئین میں ان سماجی معیارات کے حوالے سے اتفاق پایا جاتا ہے اور دونوں رسومیاتی بیانات کو بآسانی قبول کرتے ہیں، جس کی سادہ دلیل ان صفات کی ایک سے زائد ناولوں میں موجودگی ہے۔ خاتون کے بیان میں صورت اور سیرت دونوں کا تقاضا مردانہ معیارات رکھتا ہے۔

عبدالحلیم شرر کے ناول کرداروں کی صفات کے رسومیاتی استعمال کی نمایاں مثال ہیں۔ ان کے ناولوں سے مرتب ہونے والا بیانیہ مردانہ ہے، جو خاتون سے بہترین صورت اور اعلیٰ ترین سیرت کا متقاضی ہوتا ہے۔ ان کے ایک نسبتاً کم معروف ناول آغا صادق کی شادی (1902) رسومیاتی بیانات کی مثال فراہم کرتا ہے۔ شرر ناول کو عشقیہ قصہ سمجھتے تھے۔ ان کے معاشرتی ناول سماجی مسائل کی بنیاد پہ لکھے گئے۔ ان ناولوں میں ان کا بظاہر نقطہ نظر جدت پسند ہے۔ مثلاً انھوں نے پردے کی مخالفت میں ایک ناول بدر النسا کی مصیبت تحریر کیا۔ آغا صادق کی شادی میں انھوں نے بغیر دیکھے شادی کرنے کے نقصانات کی تصویر کھینچی ہے۔ ناول کے سرورق پہ لکھا ہے کہ اس اوریجنل ناول میں ناواقفیت سے اکثر شادیوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو دکھایا گیا ہے۔ آغا صادق ایک ایرانی تاجر ہے جو ہندوستان میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ ایک خوشامدی مصاحب کے ہاتھوں نکاح کے معاملے میں دھوکا کھا جاتا ہے۔ اسے ایک خوبصورت لڑکی دکھا کر ایک بدصورت لڑکی سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ ثنویت خوبصورتی اور بدصورتی کے بیان میں ہی پیدا ہوتی ہے۔

آغا صادق خوبصورتی کا خواہشمند ہے۔ آغا پہ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کی حقیقت کھلنے کے مقام پہ ہی شرر نے بدصورتی کے لسانی وسائل کو مجتمع کر دیا ہے:

> ''یا تو اس حور وش، نازنین و ناز آفریں لڑکی اور چاند سی دلھن کو بیاہ لائے تھے۔ یا اب جو دیکھتے ہیں تو وہی دلھن کے کپڑے پہنے ہوئے ایک ایسی بد صورت اور بد قطع لڑکی پاس بیٹھی کہ دیکھ کے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کالی کلوٹی، موٹے موٹے ہونٹ، پھولی اور چیچک کے داغوں کی انتہا سے زیادہ کتھری ناک، بھنچے ہوئے گال اور اس پہ طرہ یہ کہ ایک آنکھ سے کانی اور دوسری آنکھ ہے بھی تو بالکل چپڑی۔ ہا ہی اور دھینگا مشتی میں اتفاقاً سر بھی کھل گیا تو معلوم ہوا کہ چندیا گنجی ہے۔''[۱۰]

لیجیے کوئی ایسا ناک نقشے کا عیب رہ تو نہیں گیا جو شرر نے بیان میں شامل نہ کیا ہو۔ بیانیے میں ثنویت کو 'یا' کے ذریعے قائم کیا گیا ہے۔ خوبصورت لڑکی کی جو صفات شرر نے یہاں پیش کی ہیں، وہ ان کے دیگر معاشرتی اور تاریخی ناولوں میں بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً ملک العزیز ورجنا (1888) جیسے پہلے تاریخی ناول کو دیکھ لیجیے یا ان کے معاشرتی ناول دلچسپ (1885) کا مطالعہ کیجیے دونوں میں خوبصورت کو 'نازنین' اور 'ناز آفرین' کے ذریعے ہی بیان کیا گیا ہے۔ یہاں زیادہ دلچسپ بیان بدصورتی کا ہے۔ اس بیان میں چہرے کے عیوب کو باریک بینی اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ شرر کی جدت پسندی صفات کے بیان میں روایتی ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے بدصورتی سے مرد کو خوف زدہ دکھایا ہے۔ یاد رہے جملے میں فعل کا استعمال اس طور سے کیا گیا ہے کہ کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آغا صادق خوف زدہ ہو گیا ہے۔ فعل حال مطلق کا استعمال اسے عمومی بنا دیتا ہے، جس سے راوی اور قاری دونوں آغا صادق کے مشاہدے میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد بدصورتی کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ ان میں موضوعاتی سطح (topicalization) کالی رنگت کو دی گئی ہے۔ یہ جمالیاتی معیار بیانیے کو شمالی ہندوستان کے سماجی کلامیے سے منسلک کر دیتا ہے۔ ایک ایسا سماج جو مختلف نسلوں پہ مبنی ہے اور جہاں رنگ کی بنیاد پہ نسلی افتراق قائم کیا جاتا ہے۔ یہیں شرر کی جدت، ان کے ثقافتی معیارات کی روایت پسندی سے گہنا جاتی ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا انفرادی شعور بیانیے کے ذریعے سماجی رواجوں کو تبدیل کرنے کا خواہش مند ہے تاہم ان ثقافتی شعور جس نظام کلامیہ کا پروردہ ہے، وہ اسے روایت کے استحکام کے لیے استعمال کر لیتا ہے۔ یوں بیانیہ متضاد خصوصیات کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ شمالی ہند میں نقوش کا تیکھا پن بھی جمالیاتی معیار ہے اور ثریا بیگم اس سے محروم ہے، اس کے ہونٹ موٹے، ناک پھولی اور چیچک زدہ ہے جبکہ وہ

ایک آنکھ سے کانی، گال پچکے اور چندیا سے گنجی ہے۔ چہرے کے کسی حصے سے سلامتی کی خبر نہیں آئی۔ شرر نے عمومی انداز کے عین مطابق متعدد خامیاں ایک ہی جگہ جمع کر دی ہیں، جس نے کردار سے نفور پیدا کرنے کا سامان فراہم کیا ہے۔

اس ناول میں بیانیے کی پیچیدگی کو ایک اور حقیقت ہوا دیتی ہے۔ ثریا بیگم کا تعلق شریف گھرانے سے ہے۔ اردو ناول کا عمومی بیانیہ کسی شریف زادی کو بدصورت نہیں دکھاتا، بلکہ اس ناول کے علاوہ شاید ہی کہیں کم صورتی کی بھی کوئی مثال ملے۔ ایسے عالم میں اس تضاد کا کیا حل ہے؟ کیا شرر اس عمومی کلامیاتی روش سے ہٹ کر ایک شریف زادی کو بدصورت دکھا رہے ہیں، تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ بدصورتی کی انتہا دکھانے کا تعلق نسلی شرافت سے نہیں ہے، اس تضاد کی وجہ رسومیاتی ہے۔ چونکہ بیانیہ عموماً اپنی نوع میں شدت رکھتا ہے، اس لیے بدصورتی کی متعدد نشانیاں ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔ آغا صادق، ثریا بیگم کو چھوڑ دیتا ہے اور کلثوم کو اپناتا ہے، جس کا چہرہ دکھا کر اسے شادی پہ آمادہ کیا گیا تھا۔ آغا صادق کو ثریا سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ کلثوم، ایک خاتون ہی اسے اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ ثریا کی "مٹی خراب ہو گئی" ہے، کیوں کہ اب وہ گئی گزری ہو گئی ہے۔ اس کے جواب میں آغا کا جملہ ثقافتی لحاظ سے بہت بھاری ہے جو مردانہ سماجی معیارات کی سفاکیت کا برملا اظہار ہے: ''آغا صادق: مگر وہ تو پہلے بھی کسی اچھے گھر کے قابل نہ تھی۔ اس شکل و شمائل کی عورت کو بھلا کون شخص پسند کرے گا۔''[۱۱]

سماجی میل جول خصوصاً قانونی رشتوں کا قیام سماجی درجہ بندی کا اہم پیمانہ ہے۔ اس میں عام طور پہ نسلی برابری اور مرد کی بہتر سماجی درجہ بندی کا خیال رکھا جاتا تھا۔[۱۲] لیکن یہاں شادی کے لیے ایک اضافی معیار خوبصورتی کا بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ بعد ازاں ثریا بیگم کی شادی اسی مصاحب سے کر دی جاتی ہے جس نے آغا کو دھوکا دیا تھا۔ شرر کا اس شادی پہ بیان ملاحظہ کیجیے: '' ایک کالی کلوٹی، گنجی، بدقطع اور کانی جورو کی صورت ان [محمد حسین] کے حق میں ایک عذابِ الٰہی تھی۔''[۱۳]

اس بیان میں شرر نے ان صفات کا اعادہ کیا ہے جنھیں وہ آغا صادق پہ حقیقتِ حال کھلنے کے وقت بیان کر چکے ہیں۔ اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود شرر بھی سماجی معیاراتِ جمال کے اس حد تک قائل تھے کہ ایک بدصورت شریف زادی سے شادی کو عذابِ الٰہی سمجھتے تھے۔

تنقیدی کلامیاتی تجزیے میں ایک اہم اصطلاح موضوعی مقام(Subject Position) ہے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو کسی کلامیے میں سماجی طور پہ کسی شخص کو دیا جاتا ہے ۱۴۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کسی شخص کا کچھ اوامر اور نواہی کو قبول کر لینا۔ عموماً فرد سماج میں بروئے کار آتے ہوئے اپنے سماجی مقام کے مطابق عمل پذیر ہوتا ہے۔ ناول میں کسی کردار کی اچھائی یا برائی کا پیمانہ یہی موضوعی مقام طے کرتا ہے۔ جو کردار اپنے موضوعی مقام کے مطابق عمل کرتا ہے، سماجی معیار پر اسے بہترین کردار مانا جاتا ہے اور جو اس کے برعکس کرتا ہے، اسے برا قرار دیا جاتا ہے۔ ناول نگار کی طرف سے قائم کیے گئے بیانیے میں سماجی مقام ایسا نکتہ ہوتا ہے جو کردار کی مجموعی تصویر کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اکبری، بسم اللہ کی ماں اور اس ناول کی بیگما، سبھی اپنے سماجی مقام کو مطلوب انداز میں نبھانہ پانے کی وجہ سے قابلِ مذمت کردار بنتی ہیں۔

برِ عظیم میں مسلم سماج نسل کا ایک تصور رکھتا ہے۔ اس تصور کی بنیاد پیدائش، پیشہ یا برادری ہو سکتی ہے۔ یہ تصور دیگر مسلم سماجوں سے مختلف ہے۔ اسلام میں 'کفاءۃ' کے تصور کے باوصف برِ عظیم کے قدیم اور معاصر مسلم سماج میں نسلی درجہ بندی کی موجودگی نمایاں رہی ہے اور مسلم سماج کے مختلف گروہوں کے درمیان گہرے نامساوی تعلقات کے اصول عملاً موجود رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں پائی جانے والی اشراف، اجلاف اور ارزال کی تقسیم اسلام کے ابتدائی عہد میں نہ تھی (پہلی صدی ہجری کے بعد عرب و عجم کی تقسیم اور 'خادم الاسلام' اور 'جدید الاسلام' کی تقسیم ضرور موجود رہی۔) اس تقسیم کا آغاز تیرھویں صدی عیسوی میں دلی سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کی مضبوطی کے ساتھ ہوا۔ اسی دوران انتظامی امور میں نومسلموں کو ان کی سابقہ ذات کی بنیاد پہ ملازمت دی جاتی۔ اس دوران لکھے گئے بعض متون مسلمانوں میں رسول اکرم ﷺ سے نسلاً تعلق رکھنے یا نہ رکھنے کی بنیاد پہ درجہ بندی قائم کر رہے تھے۔ یہ تقسیم روزمرہ سماجی تعلقات کو ایک خاص نہج پہ کنٹرول کرنے، نسبت قائم کرنے اور اپنے متعلقہ گروہ کے مفادات کا تحفظ کرنے یا انھیں یقینی بنانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ۱۵

یہ اپنی جگہ اہم ہے کہ تیرھویں سے انیسویں صدی تک آتے آتے مسلمانوں میں نسلی درجہ بندی کا تصور اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ اس نے محاورات کی صورت اختیار کر لی تھی۔ آغا شاعر کے ناول ہیرے کی کنی کے سرورق پہ ایسا ہی ایک محاورہ درج ہے: اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں۔ اس ناول کے

مندرجات اور نتائج اسی محاورے کی تفسیر ہیں۔ اس ناول میں عام سماجی تعلقات میں عموماً اور شادی بیاہ کے معاملات میں خصوصاً 'نسل' کا خیال رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

آغا شاعر نے معاصر ناول نگاری کے عمومی چلن کے مطابق ہر باب کا کوئی عنوان دیا ہے، جو اس میں مذکور واقعات کی طرف اشارہ کناں ہوتا ہے۔ پہلے باب 'شوقین لڑکی' میں مصنف نے کم اصل لڑکی کی کمزوریاں دکھانے میں قریب دو صفحات سیاہ کیے ہیں۔ اُسے شادی کی جلدی ہے، آشنا سے ملتی ہے، سولہ برس کا سن، ماں باپ کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھتی ہے اور شکایت کرنے والی ہمسائی کو بددعائیں دیتی اور برا بھلا کہتی ہے۔ اگلے باب میں ناول کے مرکزی کردار نواب جہانگیر کو شہر کا یوسف قرار دیا گیا ہے۔ اُس زمانے کے عمومی بیانیے، باپ کی وفات کے بعد نوجوان نواب یا رئیس زادوں کو مصاحبین کے ہاتھوں لٹنے کا تاسف بیان کرتے ہیں۔ اس ناول میں آغا شاعر نے لکھا کہ باپ کی رحلت کے بعد نواب زادے کو ملنے والے اختیارات نے مالی حالت کو کوئی 'گزند' نہ پہنچایا لیکن وہ ''سلیف رسپکیٹ (حفظِ مراتب)'' کا خیال نہ رکھ سکے، ایک مالن کی بیٹی پہ عاشق ہو گئے جس کا سن کر سارے شہر کی انگلیاں ان پر اٹھنے لگیں۔[۱۶] آغا شاعر کا ناول اس سماجی درجہ بندی کو قائم رکھنا چاہتا ہے جو بیانیے سے باہر موجود ہے۔ وہ اس ناول کے ذریعے درجہ بندی کا خیال نہ رکھنے والوں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ کیسے معاملات پیش آ سکتے ہیں۔اس بیانیے میں خاص بات انگریزی ترکیب Self-Respect کا استعمال ہے۔ یہ اصطلاح جن معنوں میں آغا شاعر نے استعمال کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم ان کا بیانیہ اس اصطلاح کو انفرادی اور شخصی اکرام سے مختلف سمجھتا ہے۔ ان کے نزدیک کسی بھی شخص کی عزت سماجی پہلو رکھتی ہے اور اس کا مطلب حفظِ مراتب کا لحاظ رکھنا ہے۔ نواب جہانگیر یہی غلطی کر رہا ہے کہ وہ اپنے تعلقات میں محتاط نہیں ہے۔ وہ برابر کے لوگوں سے تعلق استوار کرنے کی بجائے اپنے سے کم تر درجے کے فرد سے جذباتی تعلق قائم کر رہا ہے۔ جب وہ کیسری سے شادی کے انتظام کا حکم دیتا ہے تو بڑی بوڑھیوں کے ہاں اس پہ کافی لے دے ہوتی ہے اور اس کی ماں بھی اس حرکت کو 'خلافِ شان' قرار دیتی ہے۔ وہ نواب کو سمجھاتی ہے کہ 'اچھی ہڈی' اور 'بری ہڈی' میں فرق ہوتا ہے۔ یہ سماجی تصور زمان و مکان سے ماورا چند بنیادی اوصاف کا انتساب کسی خاص نسلی گروہ پہ کرتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجوزہ نسل سے تعلق رکھنے والے تمام افراد یکساں صفات کے حامل ہیں۔ اور تاریخ گزرے یا مقام بدلے ان صفات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ ذہن نشین رہے کہ نسلی گروہ کی کمتری کا زیادہ تر تعلق اخلاقی کہتری سے جوڑا گیا ہے۔ مغرب کے تصورِ نسل کے

بر عکس جہاں جلد کا رنگ کسی نسلی گروہ کے تعین کا ایک اہم ترین پیمانہ ہوتا ہے، اردو ناول میں زیادہ تر رنگ کی بجائے اخلاقی اور داخلی صفات کو بطور متعینہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں عموماً کہتر نسل کی خواتین خوبصورت اور پر کشش ہیں، اور یہ ذہن نشین رہے کہ ایسے معاملات میں زیادہ تر دو مختلف نسلی گروہوں کی عورتوں کے درمیان امتیاز واضح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ثنوی متضاد جوڑے بنا کر اپنے مبینہ تصورِ نسل کا ثبوت فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ پہلو سامنے رہے کہ ناول نگار کا اپنا گروہی (نسلی) پس منظر، اُس کے کلامیے کی تشکیل میں کار فرما ہے، جس نے کلامیے کے حدود متعین کیے ہیں اور خود ناول نگار کی پوزیشن بھی واضح ہو رہی ہے۔ یہ اس امر کی طرف کی اشارہ ہے کہ کلامیے کی تشکیل میں پیدا کار کا بنیادی کردار ہے اور تحریری کلامیے کو کنٹرول کرنے اور اسے اپنی آئیڈیالوجی کے فروغ کا ذریعہ بنانے میں اس کے اختیار کو بڑی حد تک دخل ہے۔ کلامیاتی تجزیہ کرتے ہوئے کرداروں کے بارے اس نوع کے نسلی اور اخلاقی فیصلوں میں مصنف کے نسلی اور سماجی گروہی پس منظر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ جات:

1. Norman Fairclough, *Language and Power,* 3rd. (Oxford: Routledge, 2015), 70
2. Teun A. van DiJk, "Discourse and Inequality," *Lenguas Modernas* 21(1994): 19-37.
3. Ibid, 19.

۴. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

Raychaudhuri, Tapan, Dharma Kumar, Irfan Habib, and Meghnad Desai, eds. *The Cambridge Economic History of India: Volume 2, C. 1757-c. 1970*. No. 2. Cambridge University Press, 1983), 9.

۵. برِ عظیم کے معاشی ڈھانچے میں تاریخی تبدیلیوں کے اس مختصر تعارف کے لیے تپن رائے چودھری کی درج بالا کتاب سے مدد لی گئی ہے۔ برِ عظیم میں انیسویں صدی کی معاشی صورتِ حال اور خصوصاً مزدوروں کی اقسام اور ہیئت کی تفہیم کے لیے دیکھیے:

Gupta, Ranajit Das. "Structure of the Labour Market in Colonial India." *Economic and Political Weekly* 16, no. 44/46 (1981): 1781–1806. http://www.jstor.org/stable/4370376.

Parthasarathi, Prasannan. "Indian Labor History." *International Labor and Working-Class History*, no. 82 (2012): 127–35. http://www.jstor.org/stable/23391676.

Bose, Sanat. "Indian Labour and Its Historiography in Pre-Independence Period." *Social Scientist* 13, no. 4 (1985): 3–10. https://doi.org/10.2307/3517513.

Robb, Peter. "Labour in India 1860-1920: Typologies, Change and Regulation." *Journal of the Royal Asiatic Society* 4, no. 1 (1994): 37–66. http://www.jstor.org/stable/25182829.

۶. سر سید احمد خان، اسبابِ بغاوتِ ہند (علی گڑھ: یونیورسٹی پبلشرز، مسلم یونیورسٹی، 1958)، 60۔

۷. اس پہلو پر تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد نعیم، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ: 1869 تا 1947 (لاہور: کتاب محل، 2019)

8. Susan A. Gelman, Essentialism in everyday thought, Psychological Science Agenda | May 2005, https://www.apa.org/science/about/psa/2005/05/gelman

9. Robin O. Andreasen, "BIOLOGICAL CONCEPTIONS OF RACE" in *Philosophy of Biology*, eds. Mohan Matthen & Christopher Stephens (Oxford: North-Holland, 2007), 456-63.

۱۰. عبدالحلیم شرر، آغا صادق کی شادی (بمبئی: سلطان حسین تاجر کتب، س ن، [1902])، 56۔

۱۱. ایضاً، 105۔

۱۲. اس نکتے پہ مزید بحث کے لیے دیکھیے:

Imtiaz Ahmad, *Caste and Social Stratification among Muslims in India* (New Delhi: Manohar, 1978)

۱۳. عبدالحلیم شرر، آغا صادق کی شادی، 107۔

14. Norman Fairclough, *Language and Power*, 68.

15. Rémy DELAGE, "Muslim Castes in India" in *Books & Ideas.net*, trans. By Susannah Dale accessed through https://booksandideas.net/IMG/pdf/20140929_castesmusulmans_delage.pdf, on 12 December 2022.

۱۶. آغا شاعر، ہیرے کی کنی (دہلی: عزیز الاسلام پریس، 1899)